لیے تم نے اپنی زندگی کا اور اپنے والدین کی آرزوؤں کا خون کیا ہے، اس کی نگاہوں میں تمہاری کتنی وقعت ہے۔

ونے سنگھ کے دل میں ایسا جوش پیدا ہوا کہ اس وقت صوفیہ سامنے آ جاتی تو اسے ان الفاظ میں ملامت کرتا یہی میری بے حد دلی محبت کا صلہ ہے؟ تمہارے اوپر مجھے کتنا اعتماد تھا مگر اب معلوم ہوا کہ وہ تمہاری محبت کا اظہار محض ایک تماشا تھا۔ تم میرے لیے آسمان کی دیوی تھیں۔ میں نے تمہیں ایک آسمانی اجالا، ایک روحانی نور سمجھ رکھا تھا۔ آہ میں اپنا مذہب تک تمہارے قدموں پر نچھاور کرنے کو تیار تھا۔ کیا اسی لیے تم نے مجھے آگ کے منہ سے نکالا تھا؟ خیر جو ہوا اچھا ہوا۔ ایشور نے میرے مذہب کی حفاظت کی۔ یہ رنج بھی دور ہو جائے گا۔ میں تمہیں بے فائدہ کوس رہا ہوں۔ تم نے وہی کیا جو اس حالت میں ہر ایک عورت کرتی۔ مجھے رنج اس لیے ہو رہا ہے کہ میں تم سے کچھ اور ہی امید رکھتا تھا۔ یہ میری خام خیالی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ میں تمہارے قابل نہیں تھا۔ مجھ میں وہ اوصاف کہاں ہیں جن کی تم قدر کر سکتیں مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ جتنی عقیدت مجھے تم سے تھی اور اب بھی ہے اتنی شاید ہی کسی کو ہو سکتی ہو۔ مسٹر کلارک عالم بیدار مغز، قابل اور اوصاف کے مخزن ہی کیوں نہ ہو، لیکن میں نے تمہیں پہچاننے میں دھوکا نہیں کھایا ہے تو تم ان کے ساتھ خوش و خرم نہیں رہ سکو گی۔

مگر اس وقت انہیں اس مایوسی سے کہیں زیادہ رنج اس خیال سے ہو رہا تھا کہ میں اپنی ماں کی نظروں سے گر گیا۔ انہیں کیسے معلوم ہوا؟ کیا صوفی نے میرا خط تو نہیں دکھا دیا؟ اگر اس نے ایسا کیا ہے تو مجھ پر اس سے زیادہ سخت چوٹ نہ کر سکتی تھی۔ کیا عشق بیدرد ہو کر نفرت انگیز بھی ہو جاتا ہے؟ نہیں۔ صوفی پر ایسا شبہ کر کے میں اس کے ساتھ زیادتی نہ کروں گا۔ میں سمجھ گیا۔ اندو کی سادہ مزاجی نے یہ آگ لگائی ہے۔ اس نے ہنسی ہنسی میں ماتا جی سے کہہ دیا ہوگا۔ نہ جانے اسے کبھی عقل آئے گی

یا نہیں۔اس کی تو دل لگی ہوئی اور یہاں میری جان پر بن گئی۔

یہ سوچتے سوچتے ونے کے دل میں بدلہ کا خیال پیدا ہوا۔ مایوسی میں محبت بھی نفرت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ان کی زبردست خواہش ہوئی کہ صوفی کو ایک طویل خط لکھوں اور اسے خوب طعنے دوں۔وہ مضمون سوچنے لگے۔تریا چرتر کی داستانیں کتابوں میں بہت پڑھی تھیں مگر یقین نہ آتا تھا۔ مجھے یہ گمان ہی نہ ہوتا کہ عورت جسے پرماتما نے پاکیزہ،لطیف اور نازک جذبات کا مخزن بنایا ہے، اتنی بیدرد اور کج ادا ہو سکتی ہے مگر یہ تمہارا قصور نہیں ہے یہ تمہارے مذہب کا قصور ہے جس میں وفا کا کوئی معیار نہیں۔اگر تم نے ہندوؤں کی مذہبی کتب کا مطالعہ کیا ہے تو تم کو ایک نہیں بلکہ ایسی کئی دیویاں ملی ہوں گی جنہوں نے ایک مرتبہ عہد وفا کر لینے پر تمام عمر بیوگی میں گزار دی۔مسٹر کلارک کی بیوی بن کر تم ایک ہی چھلانگ میں مفتوح سے فاتح قوم کے زمرہ میں داخل ہو جاؤ گی اور بہت ممکن ہے کہ اسی خواہش نے تمہیں میرے دل پر بجلیاں گرانے پر آمادہ کیا ہو۔مگر تمہاری آنکھیں بہت جلد کھلیں گی اور تمہیں معلوم ہوگا کہ تم نے اپنا وقار بڑھایا نہیں بلکہ کھو دیا ہے۔

اس طرح ونے سنگھ نے خیالی شکوہ و شکایت کے ذریعہ اپنے دل کا غبار خوب نکالا۔اگر ان زہریلے خیالات کا ذرا بھی علم صوفیہ کو ہو جاتا تو اس دکھیا کی نہ جانے کیا حالت ہوتی۔شاید اس کی جان ہی پر بن جاتی۔مگر ونے سنگھ کو خود ہی ایسے خیالوں سے نفرت ہوئی۔انہوں نے سوچا۔میرے دل میں ایسے برے خیالات کیوں پیدا ہو رہے ہیں؟ اس کا نازک دل ایسی سخت چوٹیں برداشت نہیں کر سکتا۔اس کو مجھ سے محبت تھی۔میرا دل کہتا ہے کہ وہ اب بھی میری ہمدرد ہے۔پر میری ہی طرح وہ بھی مذہب،فرض اور رسم و رواج کی زنجیروں سے بندھی ہوئی ہے۔ممکن ہے کہ اس کے والدین نے اسے مجبور کیا ہو اور اس نے خود کو اپنی مرضی پر قربان کر دیا ہو۔یہ بھی ممکن ہے کہ ماتا جی نے اس کو میرے محبت کے راستہ سے ہٹانے کے لیے یہ تدبیر نکالی

ہو۔ وہ جتنی رحم دل ہیں اتنی غصہ ور بھی۔ میں بلا سمجھے بوجھے صوفیہ پر ایسے جھوٹے الزام لگا کر اپنا اوچھاپن دکھلا رہا ہوں۔

اسی بے قراری کی حالت میں کروٹیں بدلتے بدلتے ونے کی آنکھیں جھپک گئیں۔ کوہستانی علاقوں میں راتیں بڑی سہاونی ہوتی ہیں۔ ایک ہی جھپکی میں تڑکا ہو گیا۔ معلوم نہیں وہ کب تک پڑے سویا کرتے، لیکن پانی کی بوندیں منہ پر پڑیں تو گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ بادل گھرے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ جسونت نگر جانے کا ارادہ کر کے اٹھے تھے کہ کئی آدمیوں کو گھوڑے بھگاتے اپنی طرف آتے دیکھا۔ سمجھے شاید بیر پال سنگھ اور اس کے ساتھی ہوں گے۔ مگر قریب آنے پر معلوم ہوا کہ ریاستی پولیس کے آدمی ہیں۔ ڈاکیہ ان کے پاس ہی سویا ہوا تھا۔ پر اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ پہلے ہی اٹھ کر چلا گیا تھا۔

افسر نے پوچھا: ''تمہارا ہی نام ونے سنگھ ہے۔''

ونے سنگھ: جی ہاں۔

افسر: کل رات کو تمہارے ساتھ کئی آدمیوں نے یہاں قیام کیا تھا؟

ونے سنگھ: جی نہیں میرے ساتھ یہاں کے ڈاک خانہ کا صرف ایک ڈاکیہ تھا۔

افسر: تم بیر پال سنگھ کو جانتے ہو؟

ونے سنگھ: اتنا ہی جانتا ہوں کہ مجھے راستہ میں مل گیا تھا۔ وہاں سے کہاں گیا، یہ میں نہیں جانتا۔

افسر: تمہیں یہ معلوم تھا کہ وہ ڈاکو ہے۔

ونے سنگھ: اس نے یہاں کے سرکاری نوکروں کی شان میں اسی ڈاکو لفظ کا استعمال کیا تھا۔

افسر: اس کا مطلب میں یہ سمجھتا ہوں کہ تم کو یہ بات معلوم تھی۔

ونے سنگھ: آپ اس کو جو مطلب بھی چاہیں سمجھیں۔

افسر: اس نے یہاں سے تین میل پر سرکاری خزانہ کی گاڑی لوٹ لی ہے اور ایک سپاہی کو قتل کر ڈالا ہے۔ پولیس کو شک ہے کہ یہ سنگین جرم تمہارے ایماء سے ہوا ہے۔ اس لیے ہم تمہیں گرفتار کرتے ہیں۔

ونے سنگھ: یہ مجھ پر سراسر زیادتی ہے۔ مجھے اس ڈاکہ اور قتل کی ذرا بھی خبر نہیں ہے۔

افسر: اس کا فیصلہ عدالت سے ہوگا۔

ونے سنگھ: کم سے کم مجھے پوچھنے کا حق تو ہے کہ پولیس کے مجھ پر شک کرنے کا کیا سبب ہے؟

افسر: اسی ڈاکیہ کا بیان ہے جو رات کو تمہارے ساتھ یہاں سویا تھا۔

ونے سنگھ: (حیرت سے) یہ اسی ڈاکیہ کا بیان ہے؟

افسر: ہاں اس نے ایک گھڑی رات باقی رہنے کے وقت اس کی اطلاع دی، اب آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ریاست کی پولیس آپ جیسے بھلے آدمیوں سے کتنی چوکس رہتی ہے۔

فطرت انسانی کتنی پیچیدہ اور نا قابل فہم ہے اس کا ونے کو زندگی میں اول مرتبہ تجربہ ہوا۔ اس قدر اعتقاد و اعتبار کے پردے میں اس قدر فریب اور دغابازی؟

دو سپاہیوں نے ونے سنگھ کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ انہیں ایک گھوڑے پر سوار کر دیا اور جسونت نگر کی طرف چلے۔

## (17)

ونے سنگھ چھ ماہ سے جیل میں پڑے ہوئے ہیں۔ نہ ڈاکوؤں کا کچھ پتہ ملتا ہے، نہ ان پر مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ حکام کو اب بھی وہم ہے کہ انہی کے ایماء سے ڈاکہ پڑا تھا۔ اس لیے وہ ان پر انواع و اقسام کے مظالم کرتے ہیں۔ جب اس طریقہ سے کام چلتا ہوا نہیں دکھائی دیتا تو ترغیب سے کام لیتے ہیں اور پھر وہی پرانا طریقہ

اختیار کرتے ہیں۔ ونے سنگھ پہلے اور قیدیوں کے ساتھ رکھے گئے تھے، لیکن جب قیدیوں کو ان کی طرف مائل ہوتا دیکھا گیا تو اس خوف سے کہ کہیں جیل میں کوئی شورش نہ برپا ہو جائے انہیں سب سے الگ ایک کال کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ کوٹھڑی بہت تنگ تھی۔ ایک بھی کھڑکی نہ تھی۔ دوپہر کو بھی اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ بدبو اتنی کہ ناک پھٹتی تھی۔ چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار دروازہ کھلتا۔ محافظ کھانا رکھ کر پھر دروازہ بند کر دیتا۔ ونے سنگھ کو تکلیف برداشت کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ پر بھو پیاس سہہ سکتے تھے۔ اوڑھنے اور بچھانے کی انہیں ضرورت نہ تھی۔ اس سے انہیں کوئی خاص تکلیف نہ ہوتی تھی، لیکن تاریکی اور تعفن میں قید رہنا ان کے لیے بالکل نئی سزا تھی۔ اندر ان کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ صاف ستھری ہوا میں سانس لینے کے لیے وہ تڑپ تڑپ کر رہ جاتے تھے۔ تازہ ہوا کتنی بیش قیمت ہوتی ہے، اس کا اندازہ انہیں اب ہو رہا تھا۔ مگر ان بدسلوکیوں کے باوجود بھی وہ مغموم اور دل شکستہ نہ ہوتے تھے۔ اس سخت آزمائش ہی میں انہیں قوم کی نجات نظر آتی تھی۔ وہ اپنے دل میں کہتے تھے۔ یہ کٹھن تپسیائے بے اثر نہیں جا سکتی۔ جب تک ہم سختیاں اٹھانا نہ سیکھیں گے۔ جب تک ہم عیش و عشرت کو ترک نہ کریں گے، اس وقت تک ہم سے قوم کی کچھ بھلائی نہیں ہو سکتی۔ یہی خیال ان کو ڈھارس دیتا ہے۔

لیکن جب صوفیہ کی بے وفائی کا خیال آ جاتا تو ان کا سارا صبر، حوصلہ اور ایثار، حسرت و یاس کے ہجوم میں غائب ہو جاتا۔ وہ اپنے کو کتنا ہی سمجھاتے کہ صوفیہ نے جو کچھ کیا، مجبور ہو کر کیا ہوگا، لیکن اس دلیل سے ان کی تشفی نہ ہوتی تھی۔ کیا صوفیہ صاف صاف نہ کہہ سکتی تھی کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ شادی کے بارے میں والدین کی رائے ہمارے یہاں فیصلہ کن ہے لیکن عیسائیوں میں عورت کی منظوری ایک خاص اور ضروری بات سمجھی جاتی ہے۔ اگر صوفیہ کو کلارک سے محبت نہ تھی تو کیا وہ انہیں ٹکا سا جواب نہ دے سکتی تھی۔ دراصل صنف نازک کا رشتۂ محبت بھی نازک ہوتا

ہے جو ایک ہلکے جھٹکے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ جب صوفیہ جیسی دور اندیش، آن پر جان دینے والی، اصولوں کی پابند اور نیک دل عورت یوں بے وفائی کر سکتی ہے تو دوسری عورتوں سے کیا امید۔ اس صنف کا اعتبار کرنا ہی فضول ہے۔ صوفی نے مجھے ہمیشہ کے لیے ہوشیار کر دیا۔ ایسا سبق یاد کرا دیا جو کبھی نہ بھولے گا۔ جب صوفیہ دغا کر سکتی ہے تو ایسی کون عورت ہے جس پر اعتبار کیا جا سکے۔ آہ کیا معلوم تھا کہ اتنی بے لوثی، اتنی سادگی، اتنی نیک دلی بھی بالآخر غرض کے سامنے سر جھکائے گی! اب تمام عمر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا۔ اس سے یوں دور رہوں گا جیسے کالی ناگن سے، اس سے یوں بچ کر چلوں گا جیسے بڑے نوک دار کانٹے سے۔ کسی سے نفرت کرنا مصلحت اور شرافت کے خلاف ہے مگر اب اس جنس سے نفرت کروں گا۔

اس مایوسی، رنج اور تفکر میں پڑا ہوا کبھی کبھی وہ اتنا مضطرب ہو جاتا کہ جی میں آتا کہ چل کر اس سنگدل کے سامنے دیوار سے سر ٹکرا کر جان دے دوں گا جس میں اسے بھی پشیمان ہونا پڑے۔ میں یہاں آگ کے کنڈ میں جل رہا ہوں۔ دل میں پھپھولے پڑے ہوئے ہیں۔ وہاں کسی کو خبر بھی نہیں۔ سیر و تفریح کا لطف اٹھایا جا رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دیتا تو اسے بھی کچ ادائی اور بیدردی پر شرم آتی۔ ایشور! مجھے ان بداندیشیوں کے لیے معاف کرنا۔ میں دل جلا ہوں۔ وہ بھی میری طرح مایوسی کی آگ میں جلتی! کلارک اس کے ساتھ اسی طرح دغا کرتا جس طرح اس نے میرے ساتھ کی ہے۔ اگر میری بددعا میں کچھ اثر ہے ایک دن ضرور ہی اسے بھی رنج و غم کے آنسو بہاتے ہوئے دیکھوں گا یہ غیر ممکن ہے کہ خون ناحق رنگ نہ لائے۔

لیکن یہ مایوسی سراپا دردانگیز ہی نہ تھی۔ اس میں روحانی ترقی کے آثار بھی پوشیدہ تھے۔ ونے کے دل میں پھر وہی نیک خیالی پیدا ہو گئی جسے محبت کے خیالات نے ناپید کر دیا تھا۔ مایوسی نے غرض کو فنا کر دیا۔

ایک روز و نے سنگھ رات کے وقت لیٹے ہوئے سوچ رہے تھے کہ نہ جانے میرے ساتھیوں پر کیا گزری۔ میری طرح وہ بھی تو آفتوں میں نہیں مبتلا ہو گئے۔ کسی کی کچھ خبر ہی نہیں ملتی۔ یہ سوچ رہے تھے کہ دفعتاً ان کو اپنے سرہانے کی جانب ایک دھماکا سنائی دیا۔ وہ چونک پڑے اور کان لگا کر سننے لگے۔ معلوم ہوا کہ کچھ لوگ دیوار کھود رہے ہیں۔ دیوار پتھر کی تھی مگر بہت پرانی۔ جوڑوں میں لونی لگ گئی تھی۔ پتھر کی سلیں آسانی سے اپنی جگہ چھوڑتی جاتی تھیں۔ و نے سنگھ کو تعجب ہوا۔ ''یہ کون لوگ ہیں۔ اگر چور ہیں تو جیل کی دیوار توڑنے سے انہیں کیا ملے گا۔ شاید سمجھتے ہیں کہ جیل کے داروغہ کا یہی مکان ہے۔'' وہ اسی حیص بیص میں تھا کہ اندر روشنی کی ایک جھلک آئی۔ معلوم ہوا کہ چوروں نے اپنا کام پورا کرلیا۔ وہ نقب کے سامنے جا کر بولے۔ ''تم کون ہو؟ یہ دیوار کیوں کھود رہے ہو؟''

باہر سے آواز آئی۔ ''ہم آپ کے پرانے خادم ہیں۔ میرا نام بیر پال سنگھ ہے۔''

و نے سنگھ نے حقارت سے کہا۔ ''تمہارے لیے کسی خزانہ کی دیواریں نہیں جو جیل کی دیوار کھود رہے ہو؟ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں شور مچادوں گا۔''

بیر پال: مہاراج! ہم سے اس دن بڑا اپرادھ ہوا۔ چھما کیجیے۔ ہمیں نہ معلوم تھا کہ صرف چند منٹ ہمارے ساتھ رہنے کے سبب آپ پر آفت آجائے گی ورنہ ہم سرکاری خزانہ نہ لوٹتے۔ ہمیں رات دن یہی چنتا لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح آپ کے درشن کریں اور آپ کو اس آفت سے چھڑائیں۔ آیئے! آپ کے لیے گھوڑا حاضر ہے۔

و نے سنگھ: میں پاپیوں کے ہاتھوں اپنی حفاظت نہیں کرانا چاہتا۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ میں اتنا بڑی الزام سر پر رکھے ہوئے جیل سے بھاگ کر اپنی جان بچاؤں گا تو تم دھوکے میں ہو۔ مجھے اپنی جان اتنی پیاری نہیں ہے۔

بیر پال: خطاوار تو ہم ہیں۔ آپ تو بالکل بے خطا ہیں۔ آپ پر تو حاکموں نے یہ

محض بیجا ظلم کیا ہے۔ ایسی حالت میں آپ کو یہاں سے نکل جانے میں پس وپیش نہ کرنا چاہیے۔

ونے سنگھ: جب تک عدالت مجھے رہا نہ کردے، میں کسی طرح بھی نہیں جا سکتا۔

بیر پال: یہاں کی عدالتوں سے انصاف کی امید رکھنا چڑیا سے دودھ نکالنا ہے۔ ہم سب کے سب انہی عدالتوں کے مارے ہوئے ہیں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ میں اپنے گاؤں کا مکھیا تھا، لیکن میری ساری جائیداد صرف اس لیے ضبط کر لی گئی کہ میں نے علاقہ دار کے ہاتھوں سے ایک بے کس نوجوان لڑکی کو بچایا تھا۔ اس کے گھر میں اس کی بڑھیا ماں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ حال ہی میں بیوہ ہوگئی تھی۔ علاقہ دار کی بری نگاہ اس پر پڑ گئی اور وہ لڑکی کو اس کے گھر سے نکال کر لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے خبر مل گئی۔ رات کو جوں علاقہ دار کے آدمیوں نے بڑھیا کے گھر میں گھسنا چاہا۔ میں اپنے کئی دوستوں ہی کو ساتھ لے کر وہاں جا پہنچا اور ان بدمعاشوں کو مار کر وہاں سے نکال دیا۔ بس علاقہ دار اسی دن سے میرا جانی دشمن ہو گیا۔ مجھ پر چوری کا مقدمہ چلا کر قید کرا دیا۔ عدالت اندھی تھی جیسا علاقہ دار نے کہا ویسا ہی حاکم نے کیا۔ ایسی عدالتوں سے آپ ناحق انصاف کی امید رکھتے ہیں۔

ونے سنگھ: تم لوگ اس دن مجھ سے باتیں کرتے کرتے بندوق کی آواز سن کر ایسا بھاگے کہ مجھے تم پر اعتبار نہیں ہوتا۔

بیر پال: مہاراج! کچھ نہ پوچھیے بندوق کی آواز سنتے ہی ہم پاگل سے ہو گئے۔ ہمیں جب ریاست سے بدلہ لینے کا کوئی موقع ملتا ہے تو ہم اپنے کو بھول جاتے ہیں۔ ہمارے اوپر کوئی بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ ریاست نے ہم کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ ہمارے پرکھوں نے اپنے خون سے اس ریاست کی بنیاد ڈالی تھی۔ آج وہی ہمارے خون کی پیاسی ہو رہی ہے۔ ہم آپ کے پاس سے بھاگے تو تھوڑی دور پر اپنے غول کے کئی آدمیوں کو ریاست کے سپاہیوں سے لڑتے پایا۔ ہم پہنچتے ہی

سرکاری آدمیوں پر ٹوٹ پڑے۔ ان کی بندوقیں چھین لیں۔ ایک آدمی کو مار گرایا اور روپیوں کی تھیلیاں گھوڑوں پر لاد کر بھاگ نکلے۔ جب سے سنا ہے کہ آپ ہماری مدد کرنے کے شبہ میں گرفتار کیے گئے ہیں تب سے اسی دوڑ دھوپ میں ہیں کہ آپ کو یہاں سے نکال لے جائیں۔ یہ جگہ آپ جیسے دھرماتما، نڈر اور آزاد آدمیوں کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں اسی کا نباہ ہے جو پرلے سرے کا گھاگ، مکار اور بدمعاش ہو اور اپنا کام نکالنے کے لیے برے سے برا طریقہ اختیار کرنے میں ذرا بھی نہ ہچکے۔

ونے سنگھ نے غرور کے ساتھ جواب دیا۔ ''اگر تمہاری باتیں لفظ بہ لفظ سچ ہوں تو بھی میں کوئی ایسا کام نہ کروں گا جس سے ریاست کی بدنامی ہو۔ مجھے اپنے بھائیوں کے ہاتھ سے زہر کا پیالہ پینا منظور ہے مگر رو کر ان کو مصیبت میں ڈالنا منظور نہیں۔ اس ریاست کو ہم نے ہمیشہ فخر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور مہاراجہ صاحب کو ہم آج بھی اسی احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اسی سانگا اور پرتاب کے ورثا میں سے ہیں جنہوں نے ہندو قوم کی حفاظت میں اپنی جانیں تک دے دی تھیں۔ ہم مہاراجہ صاحب کو اپنا محافظ، اپنا خیر اندیش اور چھتری قوم کا سردار سمجھتے ہیں۔ ان کے ملازم سب ہمارے بھائی بند ہیں۔ پھر یہاں کی عدالتوں پر کیوں نہ اعتبار کریں۔ وہ ہمارے ساتھ بے انصافی بھی کریں تو ہم زبان نہ کھولیں گے۔ ریاست کو مطعون کر کے ہم اپنے آپ کو اس درجہ کے ناقابل ثابت کرتے ہیں جو ہماری زندگی کی معراج ہے۔''

بیر پال: دھوکا کھائیے گا۔

ونے سنگھ: اس کی کوئی فکر نہیں۔

بیر پال: میرے سر سے بدنامی کیسے دور ہوگی؟

ونے سنگھ: نیک اعمال سے۔

بیر پال سمجھ گیا۔ اپنے اصولوں سے منحرف نہ ہوں گے۔ پانچوں آدمی گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور ایک ہی لمحہ میں موسم سرما کی گھنی کہر نے انہیں اپنے پردہ میں چھپالیا۔ ٹاپوں کی آواز کچھ دیر تک کانوں میں آتی رہی پھر وہ بھی نہ سنائی دیں۔

اب وہ سوچنے لگے صبح جب لوگ نقب دیکھیں گے تو دل میں کیا خیال کریں گے؟ انہیں یقین ہو جائے گا کہ میں ڈاکوؤں سے ملا ہوا ہوں اور پوشیدہ طریقہ پر بھاگنے کی کوشش کر رہا ہوں، لیکن نہیں جب دیکھیں گے کہ میں بھاگنے کا موقع پا کر بھی نہ بھاگا تو ان کا دل میری طرف سے صاف ہو جائے گا۔ یہ سوچتے ہوئے انہوں نے پتھر کے ٹکڑے چن چن کر نقب بند کرنا شروع کی۔ ان کے پاس صرف ایک ہلکا سا کمبل تھا اور سرما کی سرد ہوا اس شگاف کی راہ سے سن سن کرتی آ رہی تھی۔ کھلے میدان میں شاید انہیں کبھی اتنی سردی نہ معلوم ہوئی تھی۔ ہر ہر رونگٹے میں یہ ہوا سوئی کی طرح چبھ رہی تھی۔ شگاف بند کر کے وہ لیٹ گئے۔

صبح ہوئی تو جیل خانہ میں ہل چل مچ گئی۔ ناظم، علاقہ دار سبھی موقع واردات پر پہنچ گئے۔ تحقیقات ہونے لگی۔ وہ نے سنگھ نے سارا حال کہہ سنایا۔ افسروں کو بڑی فکر ہوئی کہ کہیں ڈاکو انہیں نکال نہ لے جائیں۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ یہ طے ہوا کہ ان پر آج ہی مقدمہ چلایا جائے۔ مسلح پولیس انہیں عدالت کی طرف لے چلی۔ ہزاروں آدمیوں کی بھیڑ ساتھ ہو گئی۔ سب لوگ یہی کہہ رہے تھے۔ ''حاکم لوگ ایسے شریف، نیک دل اور پراپکاری شخص پر مقدمہ چلاتے ہیں۔ برا کرتے ہیں۔ بیچارے نے نہ جانے کس بری ساعت میں یہاں قدم رکھا تھا۔ ہم تو ابھاگے ہیں ہی، اپنے پچھلے کرموں کا پھل بھوگ رہے ہیں۔ ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیتے۔ ناحق اس آگ میں کودے۔'' کتنے ہی لوگ رو رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ حاکم انہیں سخت سزا دے گا، لمحہ لمحہ تماشائیوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی اور پولیس کو اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں یہ لوگ بگڑ نہ اٹھیں۔ دفعتاً

ایک موٹر آئی اور موٹر ڈرائیور نے پولیس کے افسر کو ایک رقعہ دیا۔ سب لوگ غور سے دیکھ رہے تھے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے؟ اتنے میں ونے سنگھ موٹر میں سوار کرائے گئے اور موٹر ہوا ہو گئی۔ سب کے سب تاکتے رہ گئے۔

جب موٹر کچھ دور نکل گئی تو ونے نے شوفر (گاڑی چلانے والے) سے پوچھا۔ ''مجھے کہاں لیے جاتے ہو؟''

شوفر نے کہا۔ ''آپ کا دیوان صاحب نے بلایا ہے۔''

ونے سنگھ نے کچھ اور نہ پوچھا۔ انہیں اس وقت خوف کے بجائے خوشی تھی کہ دیوان سے ملنے کا اچھا موقع ملا۔ اب ان سے یہاں کے متعلق کافی گفتگو ہو گی۔ سنا ہے قابل آدمی ہیں۔ دیکھوں یہاں کے موجودہ طریقوں کا جواز کیونکر ثابت کرتے ہیں۔

یکا یک شوفر نے کہا۔ ''یہ دیوان ایک ہی پاجی ہے۔ رحم کرنا تو جانتا ہی نہیں۔ ایک دن بچہ کو اسی موٹر سے ایسا گراؤں گا کہ ہڈی پسلی کا پتہ نہ چلے گا۔''

ونے سنگھ: ضرور گراؤ ایسے ظالموں کی یہی سزا ہے۔

شوفر نے حیرت سے ونے کی طرف دیکھا۔ اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ ہوا۔ ونے سنگھ کے منہ سے ایسی بات سننے کی اسے امید نہ تھی۔ اس نے سنا تھا کہ وہ اعلیٰ ترین اوصاف کے مخزن ہیں۔ ان کا دل بہت پاک ہے بولا۔ ''تو آپ کی بھی یہی مرضی ہے۔''

ونے سنگھ: کیا کیا جائے۔ ایسے آدمیوں پر اور کسی بات کا تو اثر ہی نہیں ہوتا۔

شوفر: اب تک مجھے یہی اندیشہ ہوتا تھا کہ لوگ مجھے قاتل کہیں گے، لیکن جب آپ جیسے فرشتہ خصلت شخص کی یہی خواہش ہے تو مجھے کیا ڈر۔ بچے بہت رات کو گھومنے نکلا کرتے ہیں۔ ایک ٹھوکر میں تو کام تمام ہو جائے گا۔

ونے سنگھ یہ سن کر ایسا چونکے گویا کوئی خوفناک خواب دیکھا ہو۔ انہیں معلوم ہوا کہ

میں نے ایک نفرت انگیز خیال کی تائید کر کے کتنی بڑی برائی کی ہے۔ ان کی سمجھ میں آیا کہ مخصوص آدمیوں کو کتنی احتیاط سے کچھ کہنا چاہیے کیونکہ ان کا ایک ایک لفظ ترغیب وتحریک سے معمور رہتا ہے۔ وہ دل میں پچھتا رہے تھے کہ میرے منہ سے ایسی بات نکلی ہی کیوں اور کسی طرح کمان سے نکلے ہوئے تیر کو پھیر لانے کی تدبیر سوچ رہے تھے کہ اتنے میں دیوان صاحب کا گھر آ گیا۔ بڑے پھاٹک پر دو مسلح جوان کھڑے ہوئے تھے اور پھاٹک سے ذرا فاصلہ پر دو پیتل کی توپیں رکھی ہوئی تھیں۔ پھاٹک پر موٹر رک گئی اور دونوں سپاہی وِنے سنگھ کو اندر لے چلے۔ دیوان صاحب دیوان خاص میں موجود تھے۔ انہوں نے خبر پاتے ہی وِنے کو بلا لیا۔

دیوان صاحب کا قد اونچا، بدن گٹھیلا اور رنگ گورا تھا۔ ادھیڑ ہو جانے پر بھی ان کے چہرہ کی رونق کسی کھلے ہوئے پھول کی طرح تھی۔ تنی ہوئی مونچھیں تھیں۔ سر پر مختلف رنگوں کا اودے پوری صافا، بدن پر ایک چست شکاری کوٹ نیچے اودے پوری پاجامہ اور اوپر ایک بھاری اوورکوٹ۔ سینہ پر کئی تمغے اور دیگر عزت افزا نشانات موجود تھے۔ اودے پوری رسالہ کے ساتھ یورپ کی جنگ عظیم میں شریک ہوئے تھے اور وہاں کئی نازک موقعوں پر اپنی غیر معمولی شجاعت سے فوجی افسروں کو متحیر کر دیا تھا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ اس عہدہ پر مقرر ہوئے تھے۔ سردار نیل کنٹھ سنگھ نام تھا۔ ایسا وجیہہ شخص وِنے کی نظر سے کبھی نہ گزرا تھا۔

دیوان صاحب نے وِنے سنگھ کو دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے انہیں ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولے۔ ''یہ زیور تو آپ کے جسم پر بہت زیبا نہیں ہیں، لیکن عوام کی نگاہوں میں ان کی جتنی وقعت ہے اتنی میرے ان تمغوں اور پٹیوں کی ہرگز نہیں ہے۔ یہ دیکھ کر میں آپ پر رشک کروں تو کیا نامناسب ہے؟''

وِنے سنگھ نے سمجھا تھا کہ دیوان صاحب جاتے ہی جاتے گرج پڑیں گے۔ لال پیلی آنکھیں دکھائیں گے۔ وہ اس برتاؤ کے لیے تیار تھے اور جو دیوان صاحب کی

یہ ہمدردانہ گفتگو سنی تو پس وپیش میں پڑ گئے۔ اس سخت جواب کے لیے یہاں گنجائش نہ تھی، جسے انہوں نے اپنے دل میں سوچ رکھا تھا۔ بولے۔ ''یہ تو کوئی ایسی نایاب چیز نہیں ہے جس کے لیے آپ کو رشک کرنا پڑے۔''

دیوان صاحب: (ہنس کر) آپ کے لیے نایاب نہیں، پر میرے لیے نایاب ہی ہے۔ مجھ میں ہو سچی ہمت، وہ سچا حوصلہ نہیں ہے جس کے صلہ میں یہ چیزیں ملتی ہیں۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ آپ کنور بھرت سنگھ کے سپوت بیٹے ہیں۔ ان سے میری پرانی ملاقات ہے۔ اب وہ شاید مجھے بھول گئے ہوں۔ کچھ تو اس رشتہ سے کہ آپ میرے پرانے دوست کے بیٹے ہیں اور کچھ اس رشتہ سے کہ آپ نے عین عالم شباب میں نفسانی خواہشات کو ترک کر کے قومی خدمت کا ذمہ لیا ہے۔ میرے دل میں آپ کی خاص عزت و محبت ہے۔ شخصی حیثیت سے میں آپ کی خدمات کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہوں اور تھوڑے سے وقت میں آپ نے ریاست کو جو نفع پہنچایا ہے اس کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ بے قصور ہیں اور ڈاکوؤں سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ اس کا مجھے وہم و گمان تک نہیں ہے۔ مہاراجہ صاحب سے بھی آپ کے متعلق ابھی ایک گھنٹہ تک گفتگو ہوئی۔ وہ بھی کھلے دل سے آپ کے مداح ہیں لیکن موجودہ حالات ہمیں آپ سے التجا کرنے پر مجبور کر رہے ہیں کہ بہت اچھا ہو اگر آپ رعایا سے اپنے کو جدا رکھیں۔ مجھے آپ سے یہ کہتے ہوئے دلی افسوس ہوتا ہے کہ اب یہ ریاست آپ کی مہمان داری کا لطف نہیں اٹھا سکتی۔

ونے سنگھ نے اپنے اٹھتے ہوئے غصہ کو ضبط کر کے کہا۔ ''آپ نے میرے متعلق جس حسن ظن کا اظہار کیا ہے اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں، لیکن افسوس کہ میں آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کر سکتا۔ قومی خدمت میری زندگی کا خاص مدعا ہے اور قوم سے جدا ہو کر میں اپنا عہد نہیں توڑ سکتا۔''

دیوان صاحب: اگر آپ کی زندگی کا خاص مدعا یہی ہے تو آپ کو کسی ریاست میں آنا مناسب نہ تھا۔ ریاستوں کو آپ سرکار کی محل سرا سمجھئے جہاں آفتاب کی روشنی کا بھی گزر نہیں ہو سکتا۔ ہم سب اس حرم سرا کے حبشی خواجہ سرا ہیں۔ ہم کسی کی عشق آمیز نگاہوں کو ادھر اٹھنے نہ دیں گے۔ کوئی منچلا جوان ادھر قدم مارنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ہو تو ہم اپنے عہدہ کے نا قابل خیال کیے جائیں۔ ہماری شوقین مزاج سرکار اپنی حسب خواہش تفریح کے لیے یہاں کبھی کبھی تشریف لاتی ہے۔ حرم سرا کے سوئے ہوئے بھاگ اس دن جاگتے ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ بیگمات کی دلی تمناؤں کا انحصار ان کی خوبصورتی، ناز و انداز، بناؤ اور سنگار پر ہوا کرتا ہے۔ ورنہ ہماری رسیلی سرکار ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ ہماری سرکار کو مشرقی آرائش و زیبائش پسند ہے۔ ان کا حکم ہے کہ بیگمات کا لباس اور زیور مشرقی ہو، بناؤ سنگار مشرقی ہو، ناز و کرشمہ مشرقی ہو، ان کی آنکھیں شرمیلی ہوں، مغرب کی شوخی ان میں نہ آنے پائے، ان کی رفتار ہنسوں کی چال کی طرح دھیمی ہو۔ مغربی بیگمات کی طرح اچھلتی کودتی نہ چلیں۔ وہ کنیز ہوں، وہی حرم کا داروغہ ہو، وہی حبشی غلام اور وہی اونچی چہار دیواری جس میں پرندہ پر نہ مار سکے۔ آپ نے اس محل سرا میں گھسنے کی جرأت کی ہے۔ یہ بات ہماری عاشق مزاج سرکار کو ایک آنکھ نہیں بھاتی اور آپ تنہا نہیں ہیں بلکہ آپ کے ساتھ خادمان قوم کا ایک گروہ ہے۔ اس گروہ کے متعلق طرح طرح کے شکوک پیدا ہو رہے ہیں۔ نادر شاہی حکم ہے کہ جتنی جلد ہو سکے یہ گستاخ گروہ حرم سرا سے دور بھگا دیا جائے۔ یہ دیکھیے، پولیٹیکل ایجنٹ نے آپ کے رفقاء کے کارناموں کی داستان لکھ بھیجی ہے۔ کوئی کوٹہ میں کسانوں کی انجمن قائم کرتا پھر رہا ہے۔ کوئی بیکانیر میں بیگار کی جڑ کھودنے پر آمادہ ہے۔ کوئی میواڑ میں ریاست کے ان ٹیکسوں کی مخالفت کر رہا ہے جو زمانہ قدیم سے وصول ہوتے چلے آئے ہیں۔ آپ لوگ جمہوریت کا ڈنکا بجاتے پھرتے ہیں۔ آپ لوگوں کا کہنا ہے کہ ہر انسان

کو کھانے، پہننے اور آرام سے زندگی بسر کرنے کا مساوی حق ہے۔ اس حرم سرا میں ان خیالات اور اصولوں کی اشاعت کر کے آپ سرکار بہادر کو بدگمان کر دیں گے اور اس کی آنکھیں پھر گئیں تو ہمارا دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ ہم آپ کو عشق و محبت کے گنج میں آگ نہ لگانے دیں گے۔

ہم اپنی کمزوریوں کو طنز کے پردہ میں چھپاتے ہیں۔ دیوان صاحب نے طنزیات کو مستعمل کر کے ونے کی ہمدردی حاصل کرنی چاہی تھی، لیکن ونے سنگھ اتنے بیوقوف نہ تھے۔ وہ چال بھانپ گئے اور بولے۔ ''ہمارا خیال تھا کہ ہم اپنی بے غرضانہ خدمت سے آپ کو اپنا ہمدرد بنالیں گے۔''

دیوان صاحب: اس میں آپ کو پوری کامیابی ہوئی ہے۔ ہم کو آپ سے دلی ہمدردی ہے، لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ ریزیڈنٹ صاحب کی مرضی کے خلاف ہم ایک تنکا بھی نہیں ہلا سکتے۔ آپ ہمارے اوپر رحم کیجیے۔ ہمیں اسی حالت میں چھوڑ دیجیے۔ ہم جیسے گرے ہوؤں کو اٹھانے میں آپ کو نیک نامی کی بجائے بدنامی ہی ملے گی۔

ونے سنگھ: آپ ریزیڈنٹ کی مداخلت بیجا کی مخالفت کیوں نہیں کرتے؟

دیوان صاحب: اس لیے کہ ہم آپ کی طرح بے نفس اور بے لوث نہیں ہیں۔ سرکار کی حفاظت میں ہم من مانے ٹیکس وصول کرتے ہیں، من مانے قانون بناتے ہیں، من مانی سزائیں دیتے ہیں، کوئی چوں نہیں کر سکتا۔ یہی ہماری کارگزاری سمجھی جاتی ہے۔ اسی کے صلہ میں ہم کو بڑے بڑے خطابات ملتے ہیں اور عہدہ کی ترقی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں ہم مخالفت کیوں کریں۔

دیوان صاحب کی بے غیرتی پر ونے سنگھ نے جھنجھلا کر کہا۔ ''اس سے تو یہ بدرجہا بہتر تھا کہ ریاستوں کا نشان ہی نہ رہتا۔''

دیوان صاحب: اسی لیے تو ہم آپ سے التجا کر رہے ہیں کہ اب کسی اور علاقہ کی

جانب اپنی توجہ مبذول فرمائیے۔

ونے سنگھ: اگر میں جانے سے انکار کروں؟

دیوان صاحب: تو مجھے مال افسوس کے ساتھ آپ کو اسی عدالت کے سپرد کرنا پڑے گا جہاں انصاف کا خون ہوتا ہے۔

ونے سنگھ: بے گناہ؟

دیوان صاحب: آپ پر ڈاکوؤں کی اعانت کا جرم لگا ہوا ہے۔

ونے سنگھ: ابھی آپ نے کہا ہے آپ کو میری نسبت ذرا بھی شک نہیں ہے۔

دیوان صاحب: وہ میری ذاتی رائے ہے۔ یہ میری منصبی رائے ہے۔

ونے سنگھ: آپ کو اختیار ہے۔

ونے سنگھ پھر موٹر پر بیٹھے تو سوچنے لگے جہاں ایسے ایسے بے غیرت اپنی بدنامیوں پر بغلیں بجانے والے ناخدا ہیں، اس کشتی کو ایشور ہی پار لگائے۔ چلو اچھا ہی ہوا۔ جیل میں رہنے سے ماتا جی کو تو تسکین ہوگی۔ یہاں سے جان بچا کر بھاگتا تو وہ میری طرف سے بالکل مایوس ہو جاتیں۔ اب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ان کا لکھنا بالکل بے اثر نہیں ہوا۔ چلوں اب عدالت کا سوانگ بھی دیکھ لوں۔

## (18)

صوفیہ گھر آئی تو اس کا غرور پامال ہو چکا تھا۔ وہ اپنی نگاہوں میں ذلیل ہو چکی تھی۔ اسے اب رانی صاحب پر غصہ آتا تھا نہ اپنے والدین پر۔ غصہ تھا تو صرف اپنے نفس پر، جس کے ہاتھوں اس کی اتنی رسوائی ہو چکی تھی، جس نے اس کو کانٹوں میں گھسیٹا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ نفس کو پیروں تلے کچل ڈالوں گی۔ اس کا نشان مٹا دوں گی۔ دبدھا میں پڑ کر وہ اپنے نفس کو اپنے اوپر غالب آنے کا موقع نہ دینا چاہتی تھی۔ اس نے ہمیشہ کے لیے اس کا منہ بند کر دینے کا مستحکم ارادہ کر لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ نفس کا منہ بند کر دینا بہت مشکل ہے، لیکن وہ چاہتی تھی کہ اب اگر نفس جادۂ

فرض سے منحرف ہوتو وہ اپنے اس انحراف پر نادم ضرور ہو۔ جس طرح کوئی تلک لگائے ہوئے وشنو دیوتا کا پجاری شراب کی بھٹی میں جاتے ہوئے جھجکتا ہے اور شرم سے گردن نہیں اٹھا سکتا، اسی طرح اس کا نفس بھی خوش اطواری کی بندشوں میں پڑ کر بری باتوں سے جھجکے۔ اس نفسف کشی کے لیے وہ بے وفائی اور مکاری کا الزام سر پر لینے کو تیار تھی۔ تمام عمر مایوسی اور فراق کی آگ میں جلنے کو تیار تھی۔ وہ نفس سے اس ذلت کا بدلہ لینا چاہتی تھی جو رانی کے ہاتھوں اسے برداشت کرنی پڑی تھی۔ اس کا دل شراب پینا چاہتا تھا۔ وہ اسے زہر پلا کر اس کی پیاس بجھانا چاہتی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اپنے کو مسٹر کلارک کے سپرد کر دوں گی۔ نفس کشی کا اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔

لیکن باطن میں اس کا وقار کتنا ہی مٹ گیا ہو مگر ظاہر میں وہ اس وقت اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ اپنے گھر میں اس کی اتنی خاطر و مدارات کبھی نہ ہوئی تھی۔ مسز سیوک کی آنکھوں میں وہ کبھی اتنی پیاری نہ تھی۔ ان کے منہ سے اس نے کبھی اتنی میٹھی باتیں نہ سنی تھیں۔ یہاں تک کہ اب وہ اس کی مذہبی تحقیقات سے بھی ہمدردی کا اظہار کرتی تھیں۔ عبادت کے معاملہ میں بھی اب اس پر کوئی جبر نہ کیا جاتا تھا۔ وہ اب اپنی مرضی کی مالکہ تھی اور مسز سیوک یہ دیکھ خوشی سے پھولی نہ سماتی تھیں کہ صوفیہ سب سے پہلے گرجا گھر پہنچ جاتی تھی۔ وہ سمجھتی تھیں کہ مسٹر کلارک کی صحبت کا یہ اثر ہے۔

لیکن صوفیہ کے سوا یہ اور کون جان سکتا تھا کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ اس کو روز عشق و محبت کا سوانگ بھرنا پڑتا جس سے اس کو دلی نفرت ہوتی تھی۔ اسے اپنی مرضی کے خلاف مصنوعی جذبات کی نقل کرنی پڑتی تھی۔ اسے عشق و محبت کے وہ الفاظ ہمہ تن گوش ہو کر سننے پڑتے تھے جو اس کے دل پر ہتھوڑوں کی ضرب کی طرح پڑتے تھے۔ اسے ان بیباک اور محبت بھری نگاہوں کا نشانہ بننا پڑتا تھا جن کے سامنے وہ آنکھیں بند کر لینا چاہتی تھی۔ مسٹر کلارک کی باتیں کبھی کبھی اتنی عشقیہ ہوتی

تھیں کہ صوفی کا دل چاہتا تھا کہ اس خود ساختہ طرز کا پردہ فاش کر دوں۔ اس مصنوعی زندگی کا خاتمہ کر دوں، لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اپنے دل کے درد و سوز میں ایک حاسدانہ مسرت کا احساس ہوتا تھا۔ پاپی! تیرے یہی سزا ہے۔ تو اسی قابل ہے۔ تو نے مجھے جتنا ذلیل کیا ہے اس کا تجھے کنارہ کرنا پڑے گا۔

اسی طرح وہ ہجراں نصیب رو رو کر زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ یہ تکلیف کم ہوتی ہوئی نظر نہ آتی تھی۔ صوفیہ نا معلوم طریقہ پر مسٹر کلارک سے کچھ کشیدہ خاطر رہتی تھی۔ دل بہت دبانے پر بھی ان سے نہ ملتا تھا۔ اس کی یہ کشیدگی کلارک کی آتش عشق کو اور بھی مشتعل کر رہی تھی۔ صوفیہ اگر اس حالت میں بھی انہیں منہ نہ لگاتی تھی تو اس کا خاص سبب مسٹر کلارک کی مذہبی رغبت تھی۔ اس کی نگاہ میں مذہب سے بڑھ کر کوئی بری بات نہ تھی۔ وہ اسے تنگ خیالی، نفرت اور غرور کا نشان سمجھتی تھی۔ کلارک دل ہی دل میں سمجھتے تھے کہ صوفیہ کو میں ابھی نہیں پا سکا ہوں اور اس لیے بہت زیادہ مشتاق ہونے پر بھی انہیں صوفیہ سے شادی کے متعلق گفتگو کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ انہیں یقین کامل نہ تھا کہ میری التجا قبول ہوگی، لیکن امید کا تار انہیں صوفیہ کے دامن سے باندھے ہوئے تھا۔

اسی طرح ایک سال سے زیادہ وقت گزر گیا اور مسز سیوک کو اب شک ہونے لگا کہ صوفیہ کہیں ہمیں سبز باغ تو نہیں دکھا رہی ہے۔ آخر ایک روز انہوں نے صوفیہ سے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تو رات دن مسٹر کلارک کے ساتھ بیٹھی کیا کیا کرتی ہے؟ کیا بات ہے؟ کیا وہ شادی کی بات چیت ہی نہیں کرتے؟ یا تو ہی ان سے بھاگی بھاگی پھرتی ہے؟''

صوفیہ شرم سے سرخ ہو کر بولی۔ ''وہ کہنا ہی نہیں چاہتے تو کیا میں ان کی زبان ہو جاؤں؟''

مسز سیوک: یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ عورت چاہے اور پھر بھی مرد نہ کہے۔ وہ تو

آٹھوں پہر موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔تو ہی انہیں پھسلنے نہ دیتی ہوگی۔

صوفیہ: ماما! ایسی باتیں کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔

مسز سیوک: یہ قصور تمہارا ہی ہے اور اگر تم دو چار دن میں مسٹر کلارک کو شادی کے لیے کہنے کا موقع نہ دو گی تو پھر میں تمہیں رانی صاحبہ کے پاس بھیج دوں گی اور دوبارہ بلانے کا نام نہ لوں گی۔

صوفی کانپ گئی۔رانی کے پاس لوٹ کر جانے سے مر جانا کہیں بہتر تھا۔اس نے دل میں ٹھان لیا۔آج وہ کروں گی جو آج تک کسی عورت نے نہ کیا ہوگا۔صاف کہہ دوں گی کہ میرے گھر کا دروازہ میرے لیے بند ہے۔اگر آپ مجھے پناہ دینا چاہتے ہیں تو دیجیے۔ورنہ میں اپنے لیے کوئی اور راستہ نکالوں۔مجھ سے محبت کی امید نہ رکھیے۔آپ میرے شوہر ہو سکتے ہیں۔معشوق نہیں ہو سکتے۔یہ سمجھ کر مجھے قبول کرتے ہوں تو کیجیے ورنہ پھر مجھے اپنی صورت نہ دکھایئے گا۔

شام ہوگئی تھی۔ماگھ کا مہینہ تھا۔اس پر ہوا اور بادل۔سردی سے ہاتھ پیر اکڑے جاتے تھے۔نہ کہیں زمین کا پتہ تھا نہ آسمان کا۔چاروں طرف کہرا ہی کہرا چھایا ہوا تھا۔اتوار کا دن تھا۔عیسائی عورت مرد صاف شفاف کپڑے اور دبیز لبادے پہلے ہوئے ایک ایک کر کے گرجا گھر میں داخل ہو رہے تھے۔ایک لمحہ میں جان سیوک، مسز سیوک، پربھو سیوک فٹن سے اترے۔اور لوگ تو فوراً اندر چلے گئے،صرف صوفیہ باہر رہ گئی۔دفعتاً پربھو سیوک نے باہر آ کر پوچھا۔''کیوں صوفی! مسٹر کلارک اندر گئے؟''

صوفیہ: ہاں۔ابھی ابھی گئے ہیں۔

پربھو سیوک: اور تم؟

صوفیہ نے بے کسانہ انداز میں کہا۔''میں بھی چلی جاؤں گی۔''

پربھو سیوک: آج تم بہت اداس معلوم ہوتی ہو۔

صوفیہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بولی۔ ''ہاں پربھو۔ آج میں بہت اداس ہوں۔ آج میری زندگی میں سب سے بڑی مصیبت کا دن ہے۔ کیونکہ آج میں کلارک کو اس امر پر مجبور کروں گی کہ وہ مجھ سے شادی کے خواستگار ہوں۔ میرا اخلاقی اور روحانی زوال ہو چکا۔ اب میں اپنے اصولوں پر جان دینے والی، اپنے ضمیر کی آواز کو حکم خدا سمجھنے والی، مذہبی عقائد کو دلیل کی کسوٹی پر پرکھنے والی صوفیہ نہیں ہوں۔ وہ صوفیہ اب دنیا میں نہیں ہے۔ اب میں جو کچھ ہوں اسے اپنی زبان سے کہتے ہوئے مجھے خود شرم آتی ہے۔''

پربھو سیوک شاعر ہونے پر بھی اس خیالی قوت سے بے بہرہ تھے جو دوسروں کے دل میں سما کر ان کی حالت کا احساس کرتی ہے۔ وہ خیالی دنیا میں ہمیشہ گھومتے رہتے تھے اور دنیا کے آرام و تکلیف سے اپنے کو متفکر بنانا انہیں مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ یہ دنیا کے جھمیلے ہیں۔ ان میں کیوں سر کھپائیں۔ انسان کو کھانا اور خوش رہنا چاہیے۔ وہی الفاظ صوفیہ کی زبان سے کئی مرتبہ سن چکے تھے۔ جھنجھلا کر بولے۔ ''تو اس میں رونے دھونے کی کیا ضرورت ہے۔ ماما سے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں؟ انہوں نے تمہیں مجبور تو نہیں کیا ہے۔''

صوفیہ نے حقارت کے لہجہ میں کہا۔ ''پربھو! ایسی باتوں سے دل نہ دکھاؤ۔ تم کیا جانو میرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ اپنی خوشی سے کوئی زہر کا پیالہ تو نہیں پیتا۔ شاید ہی کوئی ایسا دن جاتا ہو کہ میں تم سے اپنی سینکڑوں بار کی کہی ہوئی کہانی نہ کہتی ہوں۔ پھر بھی تم کہتے ہو۔ تمہیں مجبور کس نے کیا؟ تم تو شاعر ہو۔ تم اتنے بے حس کیسے ہو گئے؟ مجبوری کے سوا آج مجھے کون یہاں کھینچ لایا۔ آج میری یہاں آنے کی ذرا بھی خواہش نہ تھی پر یہاں موجود ہوں۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ مذہب کی رہی سہی عزت بھی میرے دل سے اٹھ گئی۔ جہلاء کو یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ مذہب خدا کی برکت ہے۔ میں کہتی ہوں۔ یہ خدائی قہر ہے جو انسانوں کو تباہ برباد کرنے